شمس العلماء مولانا عبدالرحمن
کی
خودنوشت سوانح حیات

مولانا عبدالرحمن غیر منقسم ہندوستان میں یونیورسٹیوں کے اساتذۂ عربی و فارسی کی اس پرانی نسل سے تعلق رکھتے تھے جنھوں نے نہ صرف ہندوستان میں عربی اور فارسی کے نامور فضلا اور اساتذہ پیدا کیے بلکہ ان کے علم و فضل کا طوطی یورپ میں بھی بولتا تھا پرنسپل مولوی محمد شفیع اور ڈاکٹر محمد اقبال (پنجاب یونیورسٹی لاہور) مولانا میمن عبدالعزیز اور ڈاکٹر ہادی حسن (علی گڑھ) ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (الہ آباد) ڈاکٹر وحید مرزا (لکھنؤ) ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی (کلکتہ) ڈاکٹر عظیم الدین (پٹنہ) ڈاکٹر عبدالحق (حیدرآباد) ڈاکٹر داؤد پوتہ (ممبئی) یہ سب حضرات اسی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ مولانا عبدالرحمن صاحب دہلی یونیورسٹی میں صدر شعبۂ عربی و فارسی و اردو تھے۔ مولانا کی کتاب مرآۃ الشعر جب شایع ہوتی ہے تو ملک کی علمی اور ادبی مجلسوں میں ایک مدت تک اس کا چرچا رہا اس کے علاوہ مولانا کے جو مقالات اورینٹل کالج میگزین لاہور میں شایع ہوتے تھے علمی حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ راقم الحروف نے عربی میں ایم۔اے مولانا کی نگرانی اور رہنمائی میں کیا تھا اور اس تقریب سے جو تعلق

اور تعلق سے پیدا ہوا اس کی وجہ سے آخر تک ہمیشہ نہایت مشفقانہ اور مربیانہ برتاؤ کرتے رہے مولانا کے انتقال کے بعد راقم الحروف نے برہان میں مولانا پر ایک مضمون بھی شائع کیا تھا۔ لیکن بڑی خوشی کی بات ہے کہ اب مولانا کی خود نوشت سوانح حیات کا اصل مسودہ جو مولانا کے خود اپنے قلم کا لکھا ہوا ہے ہمیں مولانا نظام الدین صاحب جو مولانا عبدالرحمٰن صاحب کی پرنسپلی مدرسہ عالیہ رام پور کے زمانہ میں مولانا کے نہایت معتمد علیہ اور لائق و فاضل ہیڈ کلرک تھے ان کی معرفت دستیاب ہو گیا ہے۔ ہم مولانا نظام الدین صاحب کے شکریہ کے ساتھ اس کو شائع کرتے ہیں۔ (اڈیٹر برہان)

بسمہ

میں ۳ فروری ۱۸۸۴ء میں، جے پور میں پیدا ہوا، وہیں پڑھا لکھا اور جوان ہوا، وہیں مہاراجہ کالج میں ایک مدرس یا ایک پروفیسر بنا۔

میں کسی علمی گھرانے میں نہیں ؛ ایک سپاہی کے گھر میں پیدا ہوا میرے والد جنرل بخیب میں نائب میجر تھے۔ کوارٹر ماسٹری کی خدمت بھی ان کے سپرد رہتی تھی۔ ریاست کے جاگیرداروں کے ہاں ان کے گھوڑے بھی ملازم تھے۔ سواروں کی سلح داری دوسروں کے نام رہتی۔ فائدے، نقصان کے مالک والد رہتے تھے۔ گھوڑوں کی سوداگری بھی والد کا دلچسپ مشغلہ تھا۔ پشکر اور بالوترے کے سالانہ میلے ان سے کم ہی چھوٹتے تھے۔

میرے بچپن اور لڑکپن میں ہمارے ہاں اچھی خاصی آسودگی تھی۔ میں بڑا ہوا تو گھر کو تنگدستی نے گھیر لیا تھا۔ مگر جلدی ہی میں مہاراجہ کالج کا ایک نے وظیفہ خوار طالب علم بن گیا۔ اور میرا وظیفہ گھر کے لئے ایک حد تک سہارے کا کام دینے لگا۔ اس زمانہ میں ڈھائی سیر کا گھی "واقعی گھی" بکتا تھا۔ ۲۶ سے ۲۸ سیر تک روپیہ کے گیہوں آتے۔ چنے، جو، جوار، مکا اور بھی سستے ہوتے تھے۔ آج کل کا سا حال نہ تھا کہ باجرا بھی آٹھ دس آنے سیر بکتا ہے۔ اس لئے آٹھ دس روپیہ ماہوار کا وظیفہ اُن دنوں ایک تنخواہ ہوتی تھی۔

میرے والد ۵۷ء کے کچھ بعد نوکری کی تلاش میں گھر (جھنجھانہ) سے نکلے اور آخر جے پور جا کر نوکر ہو گئے۔ کوئی ۳۰ برس نوکری کی، مگر نائب بخشی سے آگے نہ بڑھے اُس زمانہ کا یہی حال تھا۔ بندھ گیا سو موتی رہ گیا سو کنکر۔

صحیح ہے یا غلط یہ خدا جانے، مگر مجھے روایت یوں ہی پہنچی ہے کہ ہمارا نکاس جھکیڑے سے ہے۔ جھکیڑا کسی زمانے میں ایک متبرک جگہ تھی۔ یہاں بہت سے یگ "یگیہ" ہوئے تھے اسی لیے وہ جگہ یگ کھیڑا کہلاتی تھی۔ یہی لفظ کثرتِ استعمال سے رفتہ رفتہ جھکیڑا بن گیا۔ اس نام کا اچھا خاصہ بڑا گاؤں ضلع میرٹھ میں میرٹھ کے پاس اب بھی موجود ہے اور اس کی زمینوں سے پرانی بستی اور یگ کی رسمی چیزیں اب تک نکلتی رہتی ہیں۔

جھکیڑا مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں بھی مدتوں خالص ہندوؤں کی بستی بنا رہا۔ البتہ مغلوں کا دور آیا تو ان کی فوجوں میں ہندو بھی سپاہی اور سپاہدار ہونے لگے۔ کہتے ہیں اورنگ زیب عالم گیر کا زمانہ تھا، اس کی فوجیں اُسی کی کمان میں دکن میں لڑ رہی تھیں۔ انھیں میں جھکیڑے کے ہندو بھی تھے۔ ان کی ایک جماعت ایک بزرگ کے مزار پر اُس بزرگ کی کچھ کرامتیں دیکھ کر ایسی متاثر ہوئی کہ مسلمان ہو گئی۔ جھکیڑے کی ہندو بھائیوں کو یہ بات ایک آنکھ نہ بھائی۔ مگر کیا کر سکتے تھے دل بھر کر چپ ہو رہے اور موقعے کا انتظار کرنے لگے۔

مشکل سے ساٹھ ستر برس گزرے تھے کہ زمانے نے پلٹا کھایا مرہٹوں نے زور باندھا۔ ملک میں ہندو گردی شروع ہو گئی اب جھکیڑے کے ہندوؤں نے دکن کے نومسلموں کی اولاد کو دبانا شروع کیا اور اتنا ستایا کہ وہ اپنے گھر بار اور جنم بھوم کو چھوڑ کر ادھر اُدھر تتر بتر ہو گئے اور پھر کہیں سر جوڑ کر بیٹھنے کے قابل نہ ہو سکے۔

جھکیڑے سے یہ دیس نکالا پانے والے مسلمان زیادہ تر تنوار (تنوَر تومر) نسل کے راجپوت تھے۔ تنوروں کی بہت سی تڑیں اور کھانپیں (شاخیں) ہیں ایک ان میں بے کلیانی اور منڈے ہیں انھیں کے ہم نام لیوا ہیں۔ اور چوں کہ ہندی الاصل ہیں اس لئے شیخ اور شیخ زادے بھی کہلاتے ہیں۔

جھگڑے سے نکل کر ہمارے اسلاف کہاں کہاں گئے اور کیا کرتے رہے۔ یہ قصہ یہاں ذرا دراز کار ہے۔ کہنے کی بات صرف یہ ہے کہ بجولی میں ہمارے ایک چچا کوئی خون کر بیٹھے۔ دادا کو اپنوں کی جان خطر میں دکھائی دی تو وہ بیٹوں کو ساتھ لے کر اپنی آخری عمر میں چھولس ضلع بلند شہر میں آ رہے۔ یہیں ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ دیکھا۔ اور راہی ملک بقا ہو گئے۔ اسی لئے چھولس ہمارا جدّی نہیں آبائی وطن ہے۔ اور میں خود گویا جے پوری ہوں۔ وہیں پیدا ہوا۔ اور تیس برس کی عمر تک بیشتر وہیں رہا۔ ہاں چھولس بھی آتا جاتا رہتا تھا۔

پڑھنے کی عمر آئی تو قرآن مجید پڑھا، عملی تجوید سیکھی۔ حفظ قرآن کی سعادت مقدر نہ تھی، کوشش بھی کی، وہ حاصل نہ ہو سکی اب خالق باری اور کریما شروع کی۔ اُس زمانہ کا یہی دستور تھا۔ اُردو ابھی گھروں اور مکتبوں میں نہ آئی تھی۔ مدرسوں میں البتہ آ چکی تھی۔ اور عام رجحان اُنھیں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ آخر ہم بھی مدرسے بھیج دیتے گئے۔ انگریزی سے ابھی اوساط الناس میں نفرت تھی۔ سرسید کی تحریک نے اس وقت تک قبولِ عام نہ پایا تھا۔ عربی سرکاری مدرسوں میں وہاں پڑھائی نہ جاتی تھی۔ اس لئے ہم مدرسے کی اردو فارسی سائڈ میں داخل ہوئے۔

ریاست میں دفتر فارسی کے بجائے اردو میں ہو چکا تھا۔ مگر قدر ابھی فارسی ہی کی تھی۔ ملازمت کے لئے اسی کی پوچھ ہوتی تھی اور ملازمت ہی عام طور پر تعلیم کی معراج سمجھی جاتی ہے۔ مگر جے پور میں فارسی کی اعلیٰ تعلیم کے لئے مڈل پاس کرنا ضروری تھا تاکہ ادبی قابلیت کے ساتھ دفتری کاروبار کی صلاحیت بھی حاصل ہوتی رہے۔

مدرسے میں ہمیں ریاضی نے بہت ستایا۔ مڈل تک کی آٹھ جماعتیں ہمارے لئے ہفت خواں بن گئیں، جب یہ مرحلہ طے ہو گیا تو آگے میدان صاف تھا۔ اب ہم فارسی عربی کی طرف جھکے۔ فارسی مدرسے میں پڑھتے اور عربی استادوں کے ہاں جا کر۔

ان دنوں پنجاب میں یونیورسٹی بن کر مشرقی علوم کے امتحانات شروع ہو چکے تھے۔ مہاراجہ کالج جے پور بھی اس سے الحاق ایفلی ایٹڈ تھا ہم بھی اس کے امتحانات میں بیٹھے منشی اور منشی فاضل میں اول

آئے نمبر بھی بہت پاتے تھے۔ مدرسے میں شہرت بھی ہماری اچھی تھی، پرنسپل "کالے پدو بنرجی" کو خیال ہوا کہ ہمیں کالج میں پروفیسر بنائے چنانچہ اس نے اس کی پروا نہ ڈالی۔

پرنسپل جانتا تھا کہ فارسی کی خاطر خواہ تکمیل عربی کے بغیر نہیں ہوتی۔ یہ بھی اسے معلوم تھا کہ ہم عربی پڑھتے رہے ہیں، اس لئے اس نے ایک طرف کالج میں عربی کی جماعتیں (رفتہ رفتہ) پڑھائیں اور دوسری طرف ہماری ناخن بندی کے لئے ہمیں ایک عوض خدمت مدرس بنادیا۔ یوں ہم معلم اور متعلم بن کر آخر مولوی فاضل بھی ہو گئے مگر عربی کے کسی امتحان میں اچھے نہ رہے۔ یہ کیوں؟ عذر اس کا بدتر از گناہ ہوگا۔ ناگفتہ بہی بہتر ہے۔

فارسی کے خلاف ہمارے عربی امتحانات کے نتیجے یقیناً پرنسپل کی توقعات کے خلاف تھے لیکن وہ اس کے اسباب بھی جانتا تھا اُس نے اُس کی پروا نہ کی اور ہمیں منشی کی جماعت پڑھانے کو دے دی۔

ہم نے کئی سال منشی کو پڑھایا۔ اچھے اچھے نتیجے دکھائے۔ وقت کے پرنسپل نے بھی بہت زور مارا کہ ہمارے لئے نئی اسامی کی منظوری مل جائے۔ مگر کونسل نے نہ مانا۔ اسی بدڈلی کے زمانے میں ایک دوست نے لاہور سے بلاوا بھیج دیا کہ آکر رنگ محل ہائی اسکول میں ہیڈ مولوی بن جایئے۔ کالج سے اسکول جانا بُرا تو معلوم ہوا مگر تقاضائے وقت یہی تھا کہ چلے جائیں۔ چنانچہ گئے۔ اور اسکول میں فارسی عربی کے ہیڈ ہو گئے۔

ابھی بہت دن نہیں گزرے تھے کہ مہاراجہ کالج میں منشی عالم کی مدرسی خالی ہوئی۔ پرنسپل نے لکھا "لو اب جگہ ہو گئی ہے آنا چاہو تو آجاؤ" مگر ہم پھر نہ گئے۔ تین برس ہوئے تھے کہ دلی مشن کالج میں عربک پروفیسر کی مانگ ہوئی۔ درخواستوں کی کمی نہ تھی مقدمہ ابن خلدون کا ترجمہ ہمارا سفارشی بنا اور ہم منتخب ہو گئے۔ اور ۳۳-۳۴ برس تک اسی کالج میں پروفیسر رہے۔ ایم اے اور ایم او ایل تک پڑھایا بلکہ اس سے کچھ آگے بھی۔

دلی میں یونیورسٹی بنی تو عربی، فارسی اور اُردو ڈپارٹمنٹ کی ہیڈ شپ (صدارت) میرے

حصے میں آئی اور کوئی پندرہ برس یہ خدمت مجھ سے متعلق رہی۔ ۱۹۲۸ء میں آکسفورڈ میں انٹرنیشنل اورینٹل کانفرنس ہونے لگی تو صوبہ دہلی نے مجھے اپنا ڈیلیگیٹ بنایا اور میں حج کرتا، مصر، شام وقسطنطنیہ ہوتا ہوا یورپ چلا گیا یورپ کے سارے بڑے بڑے شہروں کی سیر کی اور آخر لندن جا پہنچا۔ تین مہینے وہاں رہا۔ وقت پر کانفرنس میں شریک ہوا۔ اور اُس میں پروفیسر مارگولیوتھ کے نظریئے پر اپنا تنقیدی مقالہ پڑھا۔

مارگولیوتھ اپنے وقت کا بڑا مستشرق عربی کا عالم مانا گیا ہے۔ وہ آکسفورڈ یونیورسٹی میں عربی کا پروفیسر تھا۔ اور کہتا تھا کہ عربی کے جس شعر کو جاہلیت کا شعر کہا جاتا ہے وہ مطلق جاہلیت کا نہیں۔ تیسری صدی میں گھڑ کر جاہلیت کے سر تھوپ دیا گیا ہے۔ لکھنے والوں نے اس نظریئے کے خلاف بہت کچھ لکھا اور خوب خوب لکھا۔ لیکن مری تحقیق وتنقید کا پہلو بالکل انوکھا تھا میں نے عربی ضرب الامثال سے عہد جاہلیت میں شعر اور اس کے اوزان کا وجود ثابت کیا تھا۔ اور پھر قیاسانہ قلم فرسائی نہیں کی تھی۔ جو کچھ کہنا تھا مارگولیوتھ کے سامنے کہہ رہا تھا۔ مقالہ میرا تقاضائے اگرچہ مختصر رہتا۔ لیکن بہت پسند کیا گیا۔ اور نہ صرف آکسفورڈ میں بلکہ مصر وشام میں بھی۔ اور مارگولیوتھ جواب کا کیا مذکور ہے، کوئی تنقیدی سوال بھی پیش نہ کر سکا۔

میں کالج اور یونیورسٹی سے ریٹائر ہو چکا تھا کہ سید بشیر حسین خاں[1] بار ایٹ لا پرائم منسٹر ریاست علیہ رامپور یوپی نے مجھے ملنے کیلئے رام پور بلایا۔ رام پور میں اِن دنوں کچھ عرصے سے مدرسۂ عالیہ کی پرنسپلی اور اصلاح کا مسئلہ درپیش تھا اور سید صاحب کی نگاہ میں یہ کام میں انجام دے سکتا تھا۔ اور وہ اس سے پہلے مجھے پرنسپلی کا پیغام دے بھی چکے تھے۔ لیکن میں اصلاح کی دشواری کو سمجھتا تھا۔ اس لیے اس سے بچنا چاہتا تھا مگر بچ نہ سکا۔ میں سمجھتا تھا کہ میری پہلوتہی پر سید صاحب اپنے خیال سے دست بردار ہو چکے ہیں مگر میرا یہ خیال صحیح نہ تھا۔ میں اِن کے بلانے پر رام پور پہنچا تو وہ مجھے سرکار کے دربار میں لے پہنچے اور اعلیحضرت کا حکم ہوا کہ مدرسۂ عالیہ کی اصلاح کروں۔ اب مجھے سر تسلیم خم کرنا ہی چاہیئے تھا چنانچہ حکم کی تعمیل کی۔ اور مدرسۂ عالیہ میں پرنسپل بنکر جا بیٹھا۔ مدرسۂ عالیہ رام پور دہی مدرسہ ہے

[1] مسودہ میں اسی طرح ہے۔

جسکی مشیخت وصدارت کیلئے ایک دن مولینا عبدالعلی مرحوم بحرالعلوم کو بلایا گیا تھا۔ ملّا حسن جس کی صدارت کرتے ہوئے رام پور ہی میں پیوندِ زمیں ہوئے تھے۔ کہاں اِس مدرسے کی صدارت اور کہاں میں۔ چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک۔ لیکن ہمارے اِس وقت کا مدرسۂ عالیہ بھی وہ مدرسۂ عالیہ نہیں رہا تھا اِسی لئے اسکی اِصلاح کی ضرورت تھی۔

دنیا میں ہر اصلاح ایک گونہ فساد اپنے ساتھ لاتی ہے پھر ان میں سے جو غالب آجاتے یہی مجھے بھی مدرسۂ عالیہ میں پیش آیا۔ دیرینہ جمود وخمود میں ایک ارتعاشی حرکت ضرور پیدا ہوئی۔ مگر جو اصلاح ہونی چاہیئے تھی وہ نہ ہوسکی۔ یہ کیوں اسے جاننے والے جانتے ہیں نہ جاننے والوں کو جاننے سے کچھ فائدہ نہیں۔ ابھی اصلاحی کشاکش جاری تھی کہ میری بیماری کا تقاضہ ہوا کہ خدمت سے استعفا دیدوں اور کام کو چھوڑ کر آرام کروں۔ چنانچہ یہی کیا۔ مگر غائبانہ استعفیٰ بھیجنا پڑا۔ اس کا مجھے اُس وقت بھی افسوس ہوا اور آج بھی ہے۔ استعفیٰ دینا میرے لئے لازمی ہوچکا تھا۔ لیکن مجھے رام پور پہنچ کر ہی دینا چاہیئے تھا۔

علمی تحصیل میری درس ومطالعہ دونوں کی ممنونِ منت ہے۔ میرے پڑھنے پڑھانے کے وقت میں درسِ نظامی اگرچہ جگہ جگہ کا مختلف ہوچکا تھا لیکن میں نے اُن میں سے کوئی بھی درسِ نظامی پورا نہیں کیا۔ اگرچہ میری طالب علمی لاہور کی مدرسی اور دلی کی پروفیسری کے زمانہ تک رہ رہ کر چلتی رہی۔

میرے اساتذہ رحمہم اللہ تعالیٰ خود یگانۂ روزگار اگرچہ بعض اوقات کہہ گزرتے تھے

؎ یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ یاد رکھو فسانہ ہیں ہم لوگ

لیکن اعیانِ روزگار کے یادگار تھے اُن کے تلمذ کا سلسلہ شاہ اسحاق دہلوی۔ مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی اور مفتی محمد عباس لکھنوی تک پہنچتا تھا۔ اس لئے باہمہ بیچدانی مجھے بھی یہ کہنے کا حق حاصل ہے۔ گرچہ خُردیم نسبتے است بزرگ ذرۂ آفتاب تابانیم۔ رحمہم اللہ تعالیٰ۔

درسی تحصیل آدمی کو منزل کی راہ پر ڈالتی ہے۔ منزل تک اسے مطالعہ پہنچاتا ہے۔ مطالعہ

کا مجھے اول ہی سے شوق تھا۔ اتفاق سے سامان بھی اس کا میسر آتا رہا۔ اس لئے اس کی بدولت پایا جو کچھ پایا اور بفضلہ اتنا اور ایسا پایا کہ بہت سے مدعی فضل و کمال اس تک نہیں پہنچے۔

۱۹۰۱ء میں دلی، جے پور کے جنتر منتروں (رصد گاہوں) کی مرمت ہونے لگی۔ زیج محمد شاہی درستی کی بنیاد قرار پائی۔ پنڈت چندر دھر گلہری اس خدمت پر مامور ہوئے۔ زیج محمد شاہی کا انھیں سمجھانا ہمارے ذمے آیا۔ ہمیں اس میں کوئی دقت بھی پیش نہ آئی۔ تصریح اور چغمینی اور ان کی شرحیں پڑھنے والے منہ ہی تکتے رہ گئے۔

اسی زمانے میں بعض عصری طبیعیات کی کتابوں کے مطالعہ کا اتفاق ہوا۔ وہ بہت پسند آئیں۔ العروس البدیعیہ۔ فی علم الطبیعیۃ کا ترجمہ شروع کیا۔ کتاب بڑی تھی۔ کچھ ابواب کا ترجمہ کیا تھا کہ جے پور سے لاہور جانا پڑا۔ وہاں دوسرے مشاغل شروع ہو گئے۔ وہ ترجمہ ناتمام رہ گیا چوں کہ پہلا کام تھا اس لئے بہت عزیز تھا وہ لاہور سے دلی بھی ساتھ آیا۔ وہاں ایک شاگرد دیکھنے کے لئے لے گئے۔ پھر وہ واپس نہ آیا۔

لاہور پہنچتے ہی ہم نے مقدمۂ ابن خلدون کا اردو میں ترجمہ کیا۔ کام اجرت پر کیا۔ مگر اجرت بالکل ہیچ تھی لوگ بڑی بڑی اجرتوں پر بھی راضی نہ تھے۔ ہم نوگرفتار نا آزمودہ کار تھے، اور ضرورتمند بھی۔ بیچ ہی کو بہت کچھ سمجھ لیا۔ اور ترجمہ شروع کر دیا۔

بکے مفت میں ہم زمانے کے ہاتھوں　　یہ دیکھا تو تھی یہ بھی قیمت زیادہ

کام لینے والے ہمیں وہ مہربان ملے تھے جو کہتے تھے کہ نام رکھ لو یا دام لے لو۔ ہم نے نام کو چھوڑ کر دام لینا پسند کیا۔ اسی لئے مقدمۂ ابن خلدون اور الحصون الحمیدیہ کے ترجموں کے سوا کسی کام پر ہمارا نام نہیں آیا۔ حالاں کہ وہ ان سے دو چند نہیں تو چند در چند ضرور تھا۔

دہلی آکر ۱۹۰۶ء کے بعد بھی عرصہ تک لاہور اور امرتسر کے خریداروں کی خاطر ہم کچھ نہ کچھ لکھتے اور اب اس کا نعم البدل پاتے رہے لیکن اب وہ حاجت اور ضرورت نہیں رہی تھی جو اس سے پہلے تھی۔ اس لئے رفتہ رفتہ کام کو چھوڑ کر آرام پر کمر باندھ لی۔ اور قلم ہاتھ سے رکھ دیا۔

سینٹ اسٹیفنس کالج میں مسٹر سی ایف اینڈروز انگریزی کے علاوہ ہندوستان کی

اسلامی تاریخ بھی پڑھایا کرتے تھے۔ یہ دیکھ کر کہ مجھے بھی اس میں کچھ درک ہے۔ کبھی کبھی اس عہد کی تاریخ کے کسی مسئلے میں مجھ سے بھی گفتگو کرنے لگ جاتے تھے۔ ۱۹۱۲ء میں وہ سینٹ سٹیفنس کالج چھوڑ کر گورو کے اسکول "شانتی نکیتن" جانے لگے تو کالج کے پرنسپل سے کہہ گئے کہ ہندوستان کی اسلامی تاریخ ایم اے کی عبدالرحمن کو دینا، تمھارے کالج میں وہی اس کا اہل ہے۔

مسٹر سی۔ ایف اینڈروز سینٹ سٹیفنس کالج میں محض ایک پروفیسر تھے، مگر سارے کالج میں محض ایک پروفیسر تھے، مگر سارے کالج کی روح رواں تھے۔ کالج ان کے اشاروں پر چلتا تھا۔ یہی جناب تھے جو ٹیگور صاحب کو یورپ لے گئے۔ اور ان کو نوبل پرائز ملنے کا موجب ہوئے۔ یہی صاحب افریقہ جا کر گاندھی جی کو اپنے ساتھ لاتے اور ان کی سیاست کے حامی کار بنے۔ سارا ملک گاندھی جی کی مانتا تھا۔ مگر گاندھی سی ایف اینڈروز کی بات کو نہ ٹالتے تھے۔

کالج کے پرنسپل مسٹر رودرا نے اینڈروز صاحب کا قول مجھے سنایا تو میں نے سنتے ہی دل میں کہا "سنگ آمد و سخت آمد" انکار بے کار تھا۔ اس لئے میں نے کہا۔ کہ دلی میں اور جنرل تاریخی مواد گویا ناپید ہے۔ میں انگریزی نہیں جانتا۔ ایم۔ اے کو پڑھانا اور اردو میں پڑھانا یہ کیا بات ہوئی۔ پرنسپل نے کہا مواد جہاں سے ملے جا کر لاؤ۔ خرچ اسکا کالج دے گا۔ رہا ایم اے کو اردو میں پڑھانا۔ سین کو نہیں دیکھتے وہ کیا کر رہا ہے۔ تاریخ تو فلاسفی کی برابر ٹیکنیکل (پراز اصطلاحات) بھی نہیں ہے۔ جو ایم۔ اے میں آتے ہیں وہ انگریزی تو جانتے ہی ہیں انھیں علم چاہیئے۔ اس کے لئے اپنی زبان سے بہتر کوئی زبان نہیں ہو سکتی۔ اب میرے پاس کوئی عذر نہ تھا۔ خاموش ہو گیا۔

سین صاحب سینٹ سٹیفنس کالج میں فلاسفی کے پروفیسر تھے۔ اور مجھ سے صرف پندرہ دن سینیر تھے۔ فلسفہ پر بڑی اچھی نظر رکھتے تھے، فلسفہ کتابوں سے نہیں اپنی باتوں سے پڑھایا کرتے تھے۔ جو اردو نہ ہوتی تھی نہ ہندی۔ نہ انگریزی اور بنگالی۔ ان کے پڑھانے کی دور دور دھوم تھی دور دور سے لوگ ان سے پڑھنے آتے تھے۔ شمالی ہندوستان کے تمام کالجوں میں

ان کے شاگرد اب بھی پروفیسر ہیں۔ اور بعض بعض بنا بے استاد کی تقلید میں فلسفہ اردو میں ہندی میں بالوں میں پڑھاتے ہیں اور کامیاب پروفیسر ہیں۔

ہم نے اردو میں ایم۔اے کو تاریخ پڑھانی شروع کی تو باہر والے بھی سننے آتے تھے۔ کئی سال یہ سلسلہ چلتا رہا پھر پنجاب یونیورسٹی نے اس پرچے کو تاریخی تھیسس (تحقیقی و تنقیدی مقالہ) سے بدل دیا۔ اس کی رہنمائی و نگرانی بھی اکثر میرے ہی ذمے رہی۔ مجھے بھی اس سے زیادہ دلچسپی ہوئی کہ اس میں تحقیق و تنقید کا زیادہ موقع ملتا تھا۔ اس میدان میں کام کیا تو معلوم ہوا کہ تاریخ میں تحقیق و تنقید کی بڑی گنجائش ہے۔

ہمارے تحقیقی و تنقیدی مقالات کا یہ سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ دلی یونیورسٹی بن گئی اور پنجاب سے دلی کا تعلیمی رابطہ ٹوٹ گیا۔ اور ہمارے کام کی نوعیت بدلنے لگی مگر اس وقت تک میں ان تاریخی تحقیقی کام کی وجہ سے دلی کی نئی یونیورسٹی بنانے والوں کی نگاہوں میں ایک نمایاں کارآمد شخصیت کا درجہ حاصل کر چکا تھا، اسی کا نتیجہ تھا کہ مجھے عربی فارسی اور اردو کے یکجائی ڈپارٹمنٹ کا ہیڈ یا صدر بنا دیا گیا۔

جس زمانے میں میں سینٹ سٹیفنس کالج میں عربی کا پروفیسر یا لکچرار تھا اس زمانے تک عربی و فارسی کی پروفیسری کے لئے انگریزی لازمی نہ تھی اور جامع حیثیت کے لوگ ملتے بھی کم تھے اس لئے ہمیں بھی خود انگریزی کا خیال آیا۔ نہ کالج کی طرف سے اس کا مطالبہ ہوا لیکن جب دلی میں یونیورسٹی بنی اور ہمیں ڈپارٹمنٹ کا ہیڈ ہو کر فیکلٹی اور اکیڈمک کونسل کا ممبر بننا پڑا، جہاں سارا کام صلاح مشورے تک کا انگریزی میں ہوتا تھا۔ تو اب ہمیں انگریزی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اور ہم نے لگ لپٹ کر جلدی انگریزی میں اتنی شدبد پیدا کر لی کہ یہ سمجھنے لگے کہ کہنے والے کیا کہہ رہے ہیں۔ پھر رفتہ رفتہ استعداد کچھ اور بڑھ گئی۔ مگر بولنے کی مشق نہ ہوتی تھی وہ نہ ہو سکی۔ ٹوٹے ٹوٹے مشکل ہی سے پڑھا کرتے ہیں۔

جو لوگ یونیورسٹی میں کسی ڈپارٹمنٹ کے ہیڈ یا ریڈر ہوتے تھے اور تھے کسی کالج کے آدمی۔ ان سے یونیورسٹی نے توقع کی کہ وہ کچھ کچھ ایکسٹرا (مزید) لیکچرز یونیورسٹی کے نام پر بھی دیا کریں جن کو چاہیں تو دوسرے کالج والے بھی آ کر سن لیا کریں۔ یونیورسٹی کی اس توقع پر جو مطالبے کی صورت پکڑ گئی تھی ہمیں بھی کچھ کرنا چاہئے تھا۔ ہمیں اس کام کے لئے کوئی تاریخی مضمون چننا چاہیئے تھا کہ ذکر اس کا مسٹر سین سے آگیا جن کی جگت گرولی کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ انھوں نے

کہا کہ آپ کا موضوعِ کلام خاص کر اول اول میں خالص ادبی ہونا چاہئے۔ اور ہماری مانو تو شعر اور عربی شعر کو اپنا موضوع بنا لو۔ بات معقول تھی، ہماری بھی سمجھ میں آگئی۔ اور دس گیارہ لیکچر شعر اور عربی شعر پر دے ڈالے۔

اب بعض دوستوں کا تقاضا ہوا ان کو چھپوائیے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی اصرار کہ عربی کے ساتھ ساتھ فارسی، اردو کی مثالیں اور بڑھا دی جائیں۔ اس کی میں نے تعمیل کی اور دس گیارہ میں سے سات لیکچر چھپوا دیے جو مرآۃ الشعر کے نام سے چھپ کر شائع ہو چکے ہیں اور بعض یونیورسٹیوں کے اعلیٰ امتحانات کے نصاب میں داخل ہیں۔

ادائے فرض عین انسانیت ہے۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو کام کے میدان میں فرض کی حد سے آگے بڑھ کر کام کرتے ہیں۔ مگر یہ بات ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتی۔ میں خود بھی انھیں لوگوں میں ہوں جو فرض کی حدود سے بمشکل ہی آگے بڑھتے ہیں۔ اس لئے میں نے جو کچھ بھی لکھا وہ کسی مصلحت یا مجبوری کی بنا پر لکھا۔ پھر جو کچھ کسی خاص مصلحت کے تحت میں نے لکھا اور کچھ لے دے کر یا بے لئے دئے لوگوں کو دے دیا۔ اور اس پر میرا نام نہیں آیا۔ وہ خواہ کتنا اور کیسا ہی کیوں نہ ہو اس کا اب نام لینا اور اسے اپنے کاموں میں گنوانا مناسب نہیں جانتا۔ میرا کام جو میرے نام پہ آیا وہ یہی مقدمہ ابن خلدون۔ الحصون الحمیدیہ کا اردو ترجمہ اور مرآۃ الشعر ہے یا وہ تحقیقی و تنقیدی مضامین جو کسی شوق یا اصرار کی بنا پر لکھے گئے، اور اس لئے کہ وہ بڑے پھیلاؤ کے تھے۔ پورے نہیں ہوئے تھے، ادھورے ہی پڑے رہتے۔ ان میں سے بعض بعض کا کچھ کچھ حصہ وقتاً فوقتاً بعض رسالوں میں شائع ہو گیا ہے۔ کچھ کچھ حصہ کالج کی ہسٹاریکل سوسائٹی میں بھی پڑھا جاتا رہا ہے۔ یہ ساری طویل طویل چیزیں ابھی مسودے ہی کی صورت میں تھیں۔ ابھی ان کی ترتیب و اشاعت کی نوبت نہ آئی تھی کہ ۱۹۴۷ء کا ستمبر اکتوبر آگیا اور جو کچھ اچھا برا ادھر ادھر کا کیا دھرا تھا۔ وہ ایک چشم زدن میں گاؤ خورد ہو گیا۔ اور ہم اِنّا للہ کہتے ہوئے ہندوستان سے پاکستان آگئے۔

ہم کیا ہیں کہ کوئی کام ہم سے ہوگا   کیا فائدہ فکر بیش و کم سے ہوگا
جو کچھ کہ ہوا ہوا کرم سے تیرے   جو کچھ ہوگا ترے کرم سے ہوگا

اَللّٰھُمَّ اَنْتَ خَلَقْتَنِیْ مَجَّانًا وَاَحْیَیْتَنِیْ مَجَّانًا وَرَزَقْتَنِیْ مَجَّانًا فَاغْفِرْلِیْ مَجَّانًا۔
بِرَحْمَتِكَ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْن